ڈاکٹر مہر نور محمد خان

ڈاکٹر محمد باقر کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

(خان آرزو کے تذکرہ ''مجمع النفائس'' پر مقدّمہ)

Dr. Muhammad Baqir was former Head of Persian Department and Principal Oriental College Punjab University Lahore. He started editing of "Majma-un-Nafais" by Sirajuddin Ali Khan Arzoo, a renowned scholar of the sub-continent, but he could not accomplish it. His very important critique on "Majma-un-Nafais" was unpublished so far. It is now presented in this article with a brief introduction.

❖••❖••❖••❖••❖

ڈاکٹر محمد باقر سابق صدر شعبۂ فارسی اور پرنسپل یونیورسٹی اورنٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کو تذکروں سے خاص دلچسپی تھی اور ان کے اعتناء سے کئی تذکرے شائع ہوئے جیسے ''زبدۃ المعاصرین'' اور ''مخزن الغرایب'' وغیرہ۔ انہوں نے برصغیر کے ممتاز عالم، سراج الدین علی خان آرزو کے معروف تذکرہ ''مجمع النفائس'' کی تدوین و تصحیح پر کام شروع کر رکھا تھا لیکن اسے مکمل نہ کر پائے۔ انہوں نے مجمع النفائس کا متن پنجاب یونیورسٹی میں موجود دو قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ بعد میں پاکستان نیشنل میوزیم

Scanned by CamScanner

کراچی سے ایک قلمی نسخے کا عکس بھی مقابلے کے لیے حاصل کر لیا تھا لیکن بزرگسالی اور شدتِ بیماری کے باعث اس سے تقابل کی نوبت نہ آئی۔ وفات سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے اپنا تیار کردہ متن اور نسخۂ کراچی کا عکس مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کی تحویل میں اس سفارش کے ساتھ دے دیا کہ اس کی اور ان کی مرتبہ کتاب ''تاریخ پنجاب'' کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر مرحوم کی یہ آرزو تیس سال تک پوری نہ ہو سکی۔ بالآخر ۲۰۰۴ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان نے ''مجمع النفائس'' کی اشاعت کا تہیہ کیا اور اس پر مزید تحقیق و تدقیق کے کام کی انجام دہی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے شعبہ فارسی کے دو اساتذہ ڈاکٹر مہر نور محمد خان (راقم السطور) اور ڈاکٹر محمد سرفراز ظفر کے سپرد کی تاکہ وہ اس کا نسخۂ کراچی اور کچھ دیگر قلمی نسخوں کے ساتھ تقابل کر کے ایک محقق ایڈیشن تیار کریں۔

جب تذکرہ کی تصحیح کے لیے منابع کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد باقر کے تیار شدہ متن کا آغاز سے لے کر حرف سین تک کا حصہ گم ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ گذشتہ تیس سالوں میں مرکز تحقیقات فارسی کی ایک جگہ سے دوسری جگہ میں نقل مکانی تھی۔ چونکہ پہلے ہی اس تذکرے کی اشاعت میں بہت تاخیر ہو چکی تھی لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ ''مجمع النفائس'' کی پہلی جلد ڈاکٹر محمد باقر کے مرتبہ متن کی بجائے ڈاکٹر زیب النساء علی خاں کے تدوین کردہ متن سے شائع کی جائے۔ یہ متن دراصل تہران یونیورسٹی میں ان کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ تھا لہٰذا ''مجمع النفائس'' کی پہلی جلد اواخر ۲۰۰۴ء میں شائع کر دی گئی۔ اگرچہ اس اقدام سے روشِ تحقیق میں یکسانیت کی کیفیت اور انسجام متاثر ہوئی ہے لیکن ''مجمع النفائس'' اتنا بڑا بھاری پتھر تھا کہ اگر اسے اس وقت متن کے بعض حصوں کی گمشدگی کے باعث ترک کر دیا جاتا تو آئندہ شاید اس کی طباعت کے امکانات کبھی پیدا نہ ہوتے۔

Scanned by CamScanner

خوش قسمتی سے بڑی تلاش و جستجو کے بعد محولہ بالا گمشدہ حصہ فائلوں اور کاغذات کے انبار تلے سے مل گیا۔ مقدمہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اشاعت کی مناسب جگہ تو جلد اوّل تھی لیکن چونکہ یہ پہلی جلد کی طباعت کے بعد ملا اس لیے اس کا فارسی ترجمہ ''مجمع النفائس'' کی دوسری جلد مرتبہ ڈاکٹر مہر نور محمد خان کے آغاز میں شائع کیا جا رہا ہے۔

سراج الدین علی خان آرزو (متوفی ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء) برصغیر میں فارسی زبان و ادب کے ایک مایہ ناز عالم اور پایے کے مصنف تھے۔ آپ بیک وقت شاعر، ادیب، ماہر لسانیات، نقاد، شرح نگار اور لغت نویس تھے۔ ذوق سخن، شرح سخن اور فارسی زبان شناسی میں ایسا فاضل، امیر خسرو کے بعد برصغیر کی سرزمین میں کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ ان کی متنوع تصنیفات ان کے دانش و فضل اور دقت نظری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی ایک یادگار تصنیف فارسی شعرا کا تذکرہ ''مجمع النفائس'' ہے۔ یہ صرف تذکرہ ہی نہیں بلکہ بہترین ادبی تنقید، شعر شناسی اور ادب لطیف کا شاہکار ہے۔ اس میں آرزو نے تقریباً ایک ہزار سات سو سے زیادہ شعرا اور ان کے کلام کا ذکر کیا ہے۔ اس تذکرہ کی قدر و قیمت عام تذکروں سے اس حیثیت سے بہت زیادہ ہے کہ آرزو نے اس میں شعرا کے کلام کی ادبی حیثیت پر بحث کی ہے اور اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا بقول ڈاکٹر ریحانہ خاتون، اگر مجمع النفائس کو فارسی ادب کا ''انسائیکلو پیڈیا'' کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

(احوال و آثار سراج الدین علی خان آرزو، ناشر، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۷)

اس قدر باعظمت کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محمد باقر کے ملاحظات حیرت انگیز ہیں۔ ان کے خیال میں ''مجمع النفائس'' تذکرہ نہیں بلکہ بیاض کی ایک بہتر شکل ہے کیونکہ مصنف نے اس کی تالیف میں ترتیب زمانی ملحوظ نہیں رکھی اور نہ سنین کا اہتمام کیا ہے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں یہ تاثر ''خزانۂ عامرہ'' کے مولف میر غلام علی آزاد بلگرامی کے اس بیان سے پیدا ہوا:

Scanned by CamScanner

''۔۔۔ ہرچند متوجہ تحریر احوال شعرا و ضبط تاریخ ولادت و وفات و سنوات وقایع و ذکر شعرا بہ ترتیب زمان نیست و ظاہر است فرق در بیاض و تذکرہ ھمین باشد کہ بیاض تنہا اشعار شاعر دارد و تذکرہ احوال و اشعار ہر دو دارد۔'' (خزانۂ عامرہ، ص ۱۱۸)

درست ہے کہ آرزو کی حیات میں آزاد بلگرامی کی ان سے خط و کتابت تھی لیکن فکری لحاظ سے ان کا تعلق آرزو کے مخالفین اور ایرانی مہاجر شاعر شیخ علی حزیں لاہیجی کے حامیوں میں سے تھا اور انہوں نے اپنے تذکرے ''خزانۂ عامرہ'' میں خان آرزو کی حزین لاہیجی کے اشعار پر تنقید کی مخالفت کرتے ہوئے لاہیجی کا دفاع کیا ہے۔ لہٰذا ''خزانۂ عامرہ'' کا بیان جو کہ آرزو کی وفات (۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء) کے بعد تالیف ہوا، اس ادبی مناقشہ کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے جو خان آرزو اور شیخ لاہیجی اور ان کے حامیوں کے درمیان برپا رہا۔

''تذکرہ نویسی کی عمومی روایت کے مطابق تذکرے ترتیب زمانی کی بجائے ترتیب الفبائی سے لکھے جاتے تھے۔ ان میں شاعر کے تخلص یا نام کو بنیاد بنایا جاتا تھا کیونکہ عام طور پر قاری شاعر کے تخلص سے آشنا ہوتا ہے اور اسی کے تحت تذکروں سے حالات کی جستجو کرتا ہے۔ خان آرزو نے بھی مجمع النفائس کی تدوین میں اسی روش کو مدنظر رکھا ہے۔'' (عارف نوشاہی، ڈاکٹر، مجلّہ ''پیغام آشنا''، شمارہ ۲۳، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۵)

جہاں تک شعرا کے حالات جمع نہ کرنے کا تعلق ہے ایسا نہیں کہ آرزو نے سہل انگاری کے باعث اس کا اہتمام نہیں کیا۔ یہ غالباً ان کا سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ ایرانی شعرا کے حالات تو ایرانی تذکرہ نگاروں نے تفصیل سے لکھ دیے تھے۔ جبکہ برصغیر کے شعرا کے

Scanned by CamScanner

بارے میں اطلاعات کی عدم دستیابی یا سردمہری کے باعث ان تذکروں میں یہاں کے شعرا کے سوانح بہت کم تھے اور کچھ تھے بھی تو بہت حقارت آمیز تاثرات کے عکاس تھے۔ چونکہ خان آرزو برصغیر میں فارسی شعر و ادب کے زبردست حامی اور مدافع تھے اس لیے غالباً انہوں نے ایرانی شعرا کے بارے میں تفصیل مکرر سے پہلو بچاتے ہوئے زیادہ تر توجہ برصغیر کے شعرا کی سوانح اور ادبی حیثیت کو اجاگر کرنے کی طرف مبذول کی۔

خان آرزو کے شعری ذوق سے متعلق بھی محترم ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول ''آرزو شاعروں کے شاعر اور ناقدوں کے ناقد تھے۔۔۔ فن شعر میں ان کی رائے سارے برعظیم میں مستند مانی جاتی تھی۔ دہلی کے فارسی دریختہ گویان ان کی رائے کو حدیث قدسی کا سا درجہ دیتے تھے۔ شعرا اور اہل علم و ادب اپنا کلام اور مسوّدات انہیں اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد دوم، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۳، ۱۶۳)

ایران کے مایہ ناز استاد پروفیسر ڈاکٹر شفیعی کدکنی، خان آرزو کو ''منتقد بزرگ زمانہ و سبک شناس بی ہمتای قرون'' کہتے ہیں۔ (شاعری در ہجوم منتقدان، مطبوعہ نشر آگہ، تہران، ۱۹۹۶ء، ص ۶۴)

ڈاکٹر محمد باقر نے ''مجمع النفائس'' میں ذکر کیے گئے شاعروں کی تعداد ایک ہزار چار سو یا پانچ سو کے قریب کہی ہے جب کہ مرکز تحقیقات فارسی کے اہتمام سے زیر طباعت تذکرے میں ایک اندازے کے مطابق شعرا کی تعداد ایک ہزار سات سو سے کچھ زیادہ ہی بنتی ہے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب نے شعرا کی فہرست کی تیاری میں اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے جو ناقص ہے اور اس میں بہت سے شعرا کا ذکر نہیں آیا۔

آخر میں دو ایک نکات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ خان آرزو نے ''مجمع النفائس'' میں والہ داغستانی کے ذیل میں ان کے تذکرے ''ریاض الشعرا'' کا ذکر

Scanned by CamScanner

کرتے ہوئے کہا ہے: ''تذکرۂ شعرای متقدم و متأخر نیز نوشتہ قریب بہ چہل ہزار بیت. نہایت مضبوط و فقیر آرزو بعد از نوشتن این نسخہ تذکرۂ مذکور بہ نظر آمد و الا این ہمہ دردسری کشید۔'' یعنی اگر مجھے ریاض الشعراء تذکرہ کے لکھے جانے کا علم ہوتا تو میں اپنا تذکرہ مجمع النفائس لکھنے کی زحمت نہ کرتا۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ''مجمع النفائس'' والہ کے تذکرے کے مقابلے میں کم مایہ ہے۔ دراصل نادر شاہ کے دہلی پر حملے اور قتل و غارت کے دوران والہ داغستانی نے خان آرزو کی بہت مدد کی تھی جس کا وہ یوں اعتراف کرتے ہیں: ''در این بی کسی ہا کہ ہجوم آوردہ آن قدر عطوفت فرمودہ کہ از حیز تقریر و تحریر بیرون است۔'' (مجمع النفائس در ذیل والہ داغستانی)۔ خان آرزو نے نادر شاہی افواج کی غارت گری کے دور میں والہ داغستانی کی مہربانیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِس کسر نفسی کا اظہار کیا ہے ورنہ نکتہ سنجی، ظرافت اور نقد شعر کے لحاظ سے ''ریاض الشعرا'' کے مقابلے میں ''مجمع النفائس'' کا ادبی پایہ بہت ارفع ہے۔

ایرانی سکالر احمد گلچین معانی نے اپنی کتاب تاریخ تذکرہ نویسی فارسی کی جلد دوم میں ''مجمع النفائس'' پر تبصرہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ آرزو نے قدما کی سوانح لکھتے ہوئے کلی طور پر تذکرۂ عرفات العاشقین تقی اوحدی اور تذکرۂ نصر آبادی سے استفادہ کیا ہے۔ آرزو نے ان تذکروں کے علاوہ دوسرے منابع سے بھی استفادہ کیا ہے جن کا ذکر انہوں نے مجمع النفائس کے مقدمے میں کر دیا ہے۔ نیز متن میں بھی اکثر جگہوں پر اپنے مآخذ کا ذکر کیا ہے۔ آرزو کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے نکات پر دوسرے تذکروں سے اختلاف کیا ہے بلکہ ان پر اپنے تحقیقی مطالب کا اضافہ کیا ہے۔ جہاں تک احمد گلچین معانی کی رائے کا تعلق ہے، یہ دراصل بقول ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کدکنی ''ایرانیوں کے اس احساس برتری، تکبر اور غرور کا شاخسانہ ہے (شاعری در ہجوم منتقدان، ص ۶۵) جس کے خلاف خانِ آرزو نے تنبیہ الغافلین لکھ کر قد علم کیا تھا۔

Scanned by CamScanner

استاد عالی قدر محترم ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کا ''مجمع النفائس'' پہ مقدمہ درج ذیل ہے:

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

''مجمع النفائس'' کے مؤلف سراج الدین علی خان آرزو نے اپنے حالات کتاب میں دو جگہ لکھے ہیں، لیکن کسی بھی جگہ مختلف حالات کی ایسی وضاحت نہیں کی کہ اس کا پورا نقشہ تاریخی پس منظر کے ساتھ مجلّا سامنے آ جائے۔ خود میں نے بھی آرزو کے ذکر میں بعض سوانح کا اضافہ کیا لیکن اس مقام پر مفصل حالاتِ زندگی نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ صرف مجملاً ہی چند باتیں بڑھائی جا سکتی تھیں۔ کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت خیال آیا کہ سب سے پہلے آرزو کے سوانح حیات مکمل کرنے چاہئیں۔ جن کے بغیر ان کی علمی زندگی، رتبۂ فضیلت اور درجۂ کردار کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آرزو نے صرف فارسی ہی کی خدمت کے لیے زندگی وقف نہیں کی بلکہ اردو کے ابتدائی دورِ نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ یقیناً اسی بناء پر ''مجموعہ نغز'' کے مصنف نے فرمایا تھا:

> ''بہ مثابۂ کہ اہل حق را دامت برکاتہم، عیال امام ہمام، قبلۂ انام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ می گویند، شعرای ہندی زبان را عیال خان آرزو می گویند، می سزد'' (۱)

آرزو کی شعرگوئی یا مختلف تصانیف کے متعلق کسی کی رائے کچھ ہو، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں وہ ملک کے ایک ممتاز عالم اور بلند پایہ شاعر و ادیب مانے جاتے تھے بلکہ انہیں اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کا سرخیل بھی قرار دیا جائے تو بالکل بجا ہو گا۔ پھر انہوں نے ادب کے مختلف دائروں میں اہم تصانیف ترتیب دیں جن میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان جیسی تصانیف پہلے فارسی میں موجود نہ تھیں۔ اس اعتبار سے ان کے سوانح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

Scanned by CamScanner

آرزو کے معاصر:

بعض معاصرین نے بھی آرزو کے سوانح سے خاص اعتناء فرمایا تھا۔ ان میں سب سے بڑھ کر قابل ذکر میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں جن کا تاریخی ذوق بہت عمدہ اور سلجھا ہوا تھا لیکن وہ خلد آباد (نزد اورنگ آباد دکن) میں مقیم تھے اور صرف خط و کتابت کے ذریعے سے مختلف معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ بہ ایں ہمہ، انہوں نے پہلے ''سروآزاد'' (ماثرالکرام دفتر ثانی) میں آرزو کے حالات لکھے اور یہ کتاب آرزو کی زندگی ہی میں مکمل ہوگئی، اور ''خزانۂ عامرہ'' مرتب کرتے وقت مزید حالات فراہم کیے۔ اس وقت تک آرزو کا انتقال ہو چکا تھا، چنانچہ انتقال اور میّت کی دہلی میں منتقلی کی تفصیل بھی بڑھائی۔ حاکم لاہوری آرزو کے دوست تھے۔ بارہا دہلی میں ان سے ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے اپنے تذکرے ''مردم دیدہ'' میں ذاتی تاثرات مرتب کر دیے۔ بندرابن داس خوشگو، خان آرزو کا عزیز شاگرد تھا۔ اس نے اپنا ''سفینہ'' مرتب کر کے اصلاح کے لیے مکرم استاد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اسے دیکھتے وقت آرزو نے اپنے حالات کے متعلق بعض ایسی تحریریں خود شامل کر دیں جو ''مجمع النفائس'' یا کسی دوسری کتاب میں نہیں آئی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی مآخذ تھے۔ پھر آرزو کے بعد جس صاحب علم نے اردو یا فارسی کا کوئی تذکرہ لکھا، اس میں آرزو کا ذکر تفصیلاً یا اجمالاً ضرور آیا۔ ایسی پندرہ بیس کتابیں تو میری نظر سے گذر چکی ہیں۔ میں نے تمام کتابوں سے ضروری حالات اخذ کیے۔ پھر ایک ایک واقعہ و سانحہ کے تاریخی پس منظر کا سراغ لگایا تاکہ اس کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اس طرح ایک مرقع تیار کیا جو غالباً آرزو کے حالات میں پہلا جامع اور مستند مرقع ہے۔ امید ہے یہ اس فاضل شخصیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ صحیح موازنہ کر لینے میں ہر اعتبار سے معاون و معتمد علیہ ثابت ہوگا۔

بکھرے ہوئے واقعات کو جگہ جگہ سے چن کر صحیح مقامات پر آراستہ کرنا سہل نہ

Scanned by CamScanner

تھا۔ یہ کام تاریخی پس منظر سے پوری طرح آگاہی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اس پس منظر کی روشنی میں مجھے بعض حالات کا احساس ہوا جن کے لیے مزید چھان بین ضروری تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض مآخذ سے ایسی چیزیں مل گئیں جن سے احساس کی پوری توثیق ہوئی۔

اس داستان سرائی سے مقصود معاذ اللہ یہ نہیں کہ اپنے ناچیز کام کی اہمیت جتاؤں۔ ہرگز نہیں۔ مقصود محض یہ ہے کہ خوانندگان کرام پر واضح ہو جائے کہ مجھ فرومایہ علم و عمل کو اس مہم کے سرانجام دینے میں کون کون سے مرحلے پیش آئے اور کس طرح تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے صرف اللہ کی رحمت سے علم کی روشنی ملتی گئی۔ اگر یہ مرقع تیار نہ ہوتا تو اس کے بغیر آرزو کی شخصیت کے موازنے کے لیے ایک قابل اعتماد بنیاد کیونکر استوار ہو سکتی تھی؟ اگر میری یہ ناچیز کوشش اصل راستے کو کسی قدر بھی ہموار کرنے اور اس کے مشکل مرحلوں کو ایک حد تک سہل بنانے میں مدد دے سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری مشقت خیز جستجو کا صلہ مل گیا اور علمی و ادبی خدمات کا حقیقی صلہ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے؟

تاریخ ولادت:

عام روایت کے مطابق خان آرزو ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں بہ مقام اکبرآباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔(۲) سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ''سروآزاد'' (ماثرالکرام دفتر ثانی) میں فرمایا ہے:

''ولادتِ شیخ سراج الدین علی در منتہای مآتہ حادی عشر (۱۱۰۰ء) واقع شد''۔(۳)

میر آزاد مرحوم کا آخری تذکرہ ''خزانہ عامرہ'' ''سروآزاد'' کے بعد مرتب ہوا۔

Scanned by CamScanner

جس میں آزاد کے حالات زیادہ مستند طریق پر تحریر فرمائے اور اس میں تاریخ ولادت ۱۱۰۱ھ ہی بیان کی ہے(۴)۔

''سفینۂ خوشگو'' (دفتر ثالث) کی اشاعت سے پیشتر یہی تاریخ مستند مانی جاتی تھی لیکن اب خود آرزو کی تحریر ہمارے سامنے آ گئی ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''فقیر سراج الدین علی آرزو ۔۔۔ درسال ہزارونودونہ ولادت یافتہ۔ والد مرحوم ۔۔۔ از ''نزل غیب'' تاریخ تولد یافتند۔''(۵)

تقویم کے مطابق ۱۰۹۹ھ، ۲۸ اکتوبر ۱۶۸۷ء سے شروع ہو کر ۱۷ ستمبر ۱۶۸۸ء پر ختم ہوا۔ ''نزل غیب'' سے بھی ۱۰۹۹ھ ہی برآمد ہوتے ہیں۔ مہینا معلوم نہیں کہ وثوق سے کہہ سکیں۔ خان آرزو ۱۶۸۷ء میں پیدا ہوئے یا ۱۶۸۸ء میں۔ ایسے حالات میں میرا طریق یہ ہے کہ جس عیسوی سال کی طرف قمری مہینے زیادہ ہوں اسی کو لکھنے میں ترجیح دیتا ہوں۔ یہاں ۱۶۸۷ کی طرف صرف دو مہینے ہیں اور ۱۶۸۸ء کی طرف دس مہینے، لہٰذا میں نے عیسوی سال ولادت ۱۶۸۸ء ہی اختیار کیا ہے۔

خاندان:

آرزو کا سلسلۂ نسب والد اور والدہ دونوں کی جانب سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کے والد حسام الدین، شیخ کمال الدین کے اخلاف میں سے تھے جو سلسلہ چشتیہ کے نامور بزرگ شیخ نصیرالدین محمود مشہور بہ ''چراغ دہلی'' کے بھانجے تھے۔

''خزینۃ الاصفیاء'' میں صاحب ''اخبارالاولیا'' کی روایت ان الفاظ میں درج ہے:

''شیخ نصیرالدینؒ (چراغ دہلی) را در اودھ (جو ان کاوطن تھا) خواہری بود، از وی کلان وعفیفۂ زمان۔ او نیز دو پسرداشت۔ یکی مولانا زین الدین علی، دوم کمال الدین حامد۔ و شیخ نصیرالدینؒ گاہ

Scanned by CamScanner

گاہ از حضرت شیخ (حضرت نظام الدین اولیا) اجازت گرفتہ برای
زیارت ہمشیرہ مکرمہ در اودھ تشریف بردی و بعد حصول ملاقات باز
حاضر آمدی''۔ (۶)

گویا قطعاً شبہ نہیں کہ حضرت شیخ چراغ دہلی کے ایک بھانجے کمال الدین حامد
جن کے اخلاف میں سے آرزو کے والد حسام الدین تھے اور خود شیخ کمال الدین حامد کا
ب خواجہ فریدالدین عطارؒ سے ملتا ہے۔ اسی نسبت کے پیش نظر آرزو نے کہا تھا:

جد است مرا حضرت عطار، ازیں رہ
اشعار خود اکنوں بہ نشاپور فرستم

بتانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ نیشا پور حضرت عطارؒ کا وطن تھا۔

شیخ کمال الدین اور خان آرزو کے درمیان کم و بیش ساڑھے تین سو سال کا
صل ہے۔ ان کا خاندان علم و ثروت میں پشت بہ پشت یقیناً کسی نہ کسی حد تک ممتاز رہا ہو
گا کہ ساڑھے تین سو سال میں آبائی نسبت کی یاد برابر تازہ رہی۔ اگر امتیاز کی اس حیثیت
کا رشتہ کٹ جاتا تو بظاہر یہ یاد تازہ و برقرار رہنے کی کون سی صورت تھی۔

خان آرزو کی والدہ ماجدہ کا نسب حضرت شیخ حمیدالدین معروف بہ محمد غوث
گوالیاری سے ملتا تھا۔ خان آرزو کے والد بہ سلسلہ منصب داری مختلف مقامات پر رہے۔
اغلب ہے کہ کسی وقت بہ زمانۂ قیام گوالیار یہ نکاح کر لیا ہو اور اس میں خاص کشش کا ایک
رُخ خود شیخ محمد غوث گوالیاری کی نسبت بھی ہو گی اس طرح ان کی درخواست نکاح غالباً
اسی وجہ قبول کر لی گئی کہ وہ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جو روحانی اعتبار سے ممتاز تھا۔
جس حد تک اندازہ ہو سکتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آرزو کی والدہ نے زندگی گوالیار ہی
میں گذاری اور وہ مستقل طور پر آگرہ کبھی نہ آئیں۔

اگر نسب فخر کی کوئی چیز ہوتا تو خان آرزو اپنے پدری و مادری سلسلے میں تین

Scanned by CamScanner

بزرگوں پر جتنا بھی چاہے فخر کر سکتے تھے۔ اول حضرت عطارؒ، دوم حضرت چراغ دہلی، سوم حضرت محمد غوث گوالیاری، لیکن عرفی ٹھیک ہی کہہ گیا ہے:

اما نہ بود وصف اضافی ہنر ذات
ایں فتوی ہمت بود ارباب ہمم را

نیز

مایۂ از زندگی از گہر خویش گیر
تا بکی ایں عز و ناز از اَب و عَم داشتن

اصلی سرمایۂ فخر وہی ہے جو انسان اپنے اندر پیدا کرے۔ آباؤاجداد کی استخوان فروشی کسی بے جوہر کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے اور صاحب جوہر عزت وشہرت کی اوج گاہوں کے لیے باپ دادا کے سہاروں کا کب نیاز مند ہوا ہے؟ یہ نسبتیں بھی اسی وقت زیبا معلوم ہوتی ہیں جب انسان خود صاحب کمال نہ سہی تاہم کسی نہ کسی دائرے میں کسی قابل ذکر حیثیت کا حامل ہو۔

آرزو کے والد:

آرزو کے والد ماجد کا نام حسام الدین تھا۔ وہ سپاہی پیشہ تھے اور شاہنشاہ عالمگیر کے منصب داروں میں شامل تھے۔ آرزو نے لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اور حسامی یا حسام تخلص کرتے تھے۔

''ہرچند سپاہی پیشہ بود در سلک منصب داران عالمگیر شاہی منسلک، اما گاہے بہ سلسلہ جنبانی موزونیت طبع، شعری فرمود۔''

یہ ''مجمع النفائس'' کا اقتباس ہے۔ آرزو نے شیخ حسام الدین کے جو شعر نمونے کے طور پر درج کیے ہیں، وہ بے شائبہ مبالغہ خاصے اچھے ہیں۔ بہ لحاظ مضمون بھی اور بہ اعتبار اسلوب بھی؛ حالانکہ حسام الدین نے شعر گوئی کو اپنا مستقل مشغلہ نہیں بنایا تھا جیسا

Scanned by CamScanner

کہ ان کے فرزند ارجمند نے بنا لیا تھا۔ مثلاً مندرجہ ذیل نمونے ملاحظہ فرمایئے:

گہی چین بر جبیں گاہے تبسم کردہ می آئی
بہ ہر رنگی کہ خواہی جلوہ کن، محو تماشایم

بہ آہنگ عجب بردہ است مطرب زادۂ ہوشم
کہ از حیرت سراپا ہم چو نی گہ چشم و گہ گوشم

در بیاباں ژالہ کار سنگ طفلاں می کند
در ازل شد قسمت دیوانہ از ہر باب سنگ

آخری شعر ژالہ باری کے متعلق ذاتی تجربے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ سپاہی پیشہ ہونے کی وجہ سے شیخ حسام الدین کو فوج کے ساتھ کوچ یا قیام کے دوران کھلے میدان میں ژالہ باری کا تجربہ غالباً کئی مرتبہ ہوا ہوگا۔ اسی سے یہ شعر صورت پذیر ہوا ہے۔

آرزو کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسام الدین بھی ایک لحاظ سے دانستہ یا نادانستہ بیٹے کے رجحان شعر گوئی میں تحریک کا باعث ہوئے۔ فرماتے ہیں:

"والد مرحوم در ہنگامیکہ از لشکر بہ گوالیار آمدہ بودند، در خلال شب ہا صد، دوصد بیت از اشعار متاخرین یاد می دادند۔ ہماں سرمایۂ شاعری شدہ، درعمر چہاردہ سالگی مرا ذوقی بہ شعر پیدا گردید۔" (۷)

تعلیم و تربیت:

آرزو کا اپنا بیان ہے:

۱۔ میں نے پانچ چھ سال کی عمر تک گلستان، بوستان، پندنامہ، نام حق وغیرہ کے سوا فارسی میں کچھ نہیں پڑھا تھا۔

Scanned by CamScanner

۲۔ پانچ چھ سال کی عمر سے چودہ سال کی عمر تک عربی علوم حاصل کرنے میں مشغول رہا۔

فرماتے ہیں:

''غیراز کتاب گلستان و بوستان و پند نامہ شیخ سعدی و نام حق، آنہم درپنج شش سالگی، دیگر کتب فارسی نخواند۔ تا چہاردہ سالگی بہ کسب علوم عربیہ اشتغال داشت۔''(۸)

گزارش ہے کہ فارسی کی بنیادیں استوار کرنے اور اس زبان کے صحیح ذوق کو فروغ دینے کے لیے گلستان اور بوستان سے بڑھ کر کون سی کتابیں موزوں ہوسکتی تھیں؟ ہمارے ہاں یہی کتابیں ساٹھ ستر سال پیشتر تک طفلی میں پڑھائی جاتی تھیں۔جن لوگوں نے یہ پڑھ لی تھیں وہ بے تکلف فارسی سمجھ بھی لیتے تھے اور بولتے بھی تھے۔ اور ہر وہ کتاب رواں دواں پڑھتے جاتے تھے جس میں عربی الفاظ کی کثرت نہیں ہوتی تھی۔ لطف یہ کہ شعر بھی صحیح پڑھتے تھے اور ان کا تلفظ بھی بالکل درست ہوتا تھا۔ آج یہ دونوں باتیں جستہ جستہ ہی نظر آتی ہیں، دستہ دستہ نہیں۔ پھر ان لوگوں کی عقل و دانش کو بھی فروغ حاصل کرنے میں مدد ملتی تھی اور صلاحیت فکر بھی جلا پاتی تھی۔ سبب اس کے سوا کیا تھا کہ اول نصاب موزوں تھا۔ دوم طریق تعلیم بہت اچھا تھا۔ اگرچہ اس میں آج کل کی فنیت کو زیادہ دخل نہ تھا اور درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ درخت کی نگہداشت کے اہتمام میں تو بظاہر کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا جائے مگر ڈالیوں کے دامن میں پھل کبھی نظر نہ آئے۔ اگر آئے تو شاذ و کم تر۔

شعر گوئی کا آغاز:

آرزو کی شعرگوئی کا آغاز چودہ سال کی عمر میں ہوا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ جس

Scanned by CamScanner

زمانے میں عربی کی تحصیل ختم ہوئی اسی زمانے میں شعر کہنے لگا۔ ظاہر ہے اس وقت تک فارسی کا مطالعہ محدود تھا یعنی گلستان بوستان وغیرہ پڑھ چکے تھے یا والد کے یاد کرائے ہوئے شعر ان کے لیے فارسی کا اندوختہ تھے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرزو کو فن شعر سے فطری مناسبت تھی۔ اگرچہ ان کا انداز و اسلوب وہ نہ تھا جو فطری شاعروں کا ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے ان کے اشعار دیکھے ہیں (اور ان کا سب سے بڑا ذخیرہ ''مجمع النفائس'' میں ملتا ہے) ان پر واضح ہو گا کہ آرزو کے شعروں میں شعریت کے بجائے ''علمیت'' کا رنگ غالب رہتا ہے۔

اکبرآباد (آگرہ) آرزو کا وطن تھا۔ گوالیار میں ننھیال تھی۔ لیکن وہ لکھتے ہیں:

''درشہر متھرا کہ خاک قیامت خیز و سرزمین شورانگیز است، شور جنون شعر در من افتادہ و بعد از چندگاہ باز بہ گوالیار رفتم۔''(۹)

یہ عربیت کی تحصیل سے فراغت کا زمانہ ہے جب ان کی عمر پندرہ سولہ سال یا غالباً کسی قدر زیادہ ہو گی کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس غرض سے متھرا گئے تھے جو گوالیار اور اکبرآباد کے درمیان نہیں بلکہ اکبرآباد اور دہلی کے درمیان ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے لیے کس وجہ سے متھرا کی خاک قیامت خیز و شورانگیز بن گئی۔ الفاظ سے بظاہر یہ دل کا معاملہ معلوم ہوتا ہے اور معلوم ہے کہ شعرگوئی جنون کی شکل اسی وقت اختیار کرتی ہے جب معاملہ دل کا ہو۔

گوالیار پہنچ کر آرزو میر عبدالصمد سخن کو شعر دکھانے لگے جو جزیے کے مشرف (داروغہ) کی حیثیت سے گوالیار آئے تھے۔ دو تین مہینے کے بعد تبادلہ ہو گیا اور وہ اکبرآباد چلے گئے۔ آرزو لکھتے ہیں کہ میں نے کچھ مدت بے کسی اور تنہائی میں گذاری۔ پھر میر غلام علی احسنی سے ملاقات ہو گئی او رانہیں سے مشورہ سخن ہونے لگا۔ ''مجمع النفائس'' میں آرزو نے احسنی کے حالات بھی لکھے ہیں اور استفادے کا اعتراف بھی واضح الفاظ میں کیا ہے۔

Scanned by CamScanner

سفر دکن:

یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آرزو نے اس حالت میں کتنا وقت گذارا۔ اندازے کے مطابق یہ مدت چار سال سے کم نہ ہوگی۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر تک وہ اکبر آباد یا گوالیار ہی میں رہے کیونکہ دونوں ان کے وطن تھے۔ ایک والد اور ان کے خاندان کی نسبت سے، دوسرا والدہ ماجدہ کے سبب سے۔ پھر دکن کا سفر پیش آیا۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۳ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ خوشگو نے شیخ حسام الدین کے حالات میں لکھا ہے:

''در ہزار وصد و پانزدہ رحلت فرمود۔''(۱۰)

اس وقت آرزو سولہ سال کے تھے۔ ممکن ہے والد کی وفات کے باعث انہیں ملازمت کی ضرورت پیش آ گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ والد کی خالی اسامی پر ان کے تقرر کا امکان ہو۔ اس دور میں ایسا اکثر ہوتا تھا کہ باپ کی اسامی بیٹے کو مل جاتی تھی۔ وہ گوالیار یا اکبرآباد سے دہلی جاتے ہوئے متھرا میں کچھ عرصہ ٹھہرے ہوں۔ وہاں دل کا کوئی معاملہ پیش آ گیا ہو جس کے ساتھ ہی شعر گوئی شروع ہو گئی ہو۔

۱۱۱۷ھ یا ۱۱۱۸ھ کے اوائل (۱۷۰۶ء) میں وہ منصب دار کی حیثیت سے فوج کے ساتھ دکن گئے۔ عالمگیر دکن ہی میں تھا اور وہاں متفرق لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اگرچہ شاہنشاہ تمام بڑی مہمیں ختم کر کے احمد نگر میں آ بیٹھا تھا، فوجیں شمالی ہند سے دکن جاتی تھیں اور ایک خاص مدت تک خدمات انجام دے کر لوٹ آتی تھیں۔ پھر دوسرے گروہ پہلوں کی جگہ لینے کے لیے چلے جاتے تھے۔ آرزو کا سفر بھی ایسے ہی حالات میں ہوا۔ غالباً وہ اس مقام پر نہیں پہنچنے پائے تھے جہاں انہیں متعین کیا گیا تھا کہ عالمگیر کا انتقال ہو گیا (ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق فروری ۱۷۰۷ء)۔

عالمگیر کا دوسرا فرزند محمد اعظم شاہ گجرات سے والد کی زیارت کے لیے آیا تھا۔

Scanned by CamScanner

پھر اسے واپس جانے کا حکم مل گیا۔ وہ چالیس پچاس میل گیا ہو گا کہ انتقال کی اطلاع مل گئی۔ فوراً واپس ہوا۔ میت دفن کے لیے خلد آباد بھجوائی۔ خود بادشاہی کی بیعت لی اور بڑے بھائی سے لڑ کر تاج و تخت کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے شمالی ہند کی طرف روانہ ہو پڑا۔ آرزو اس کے ساتھ دکن سے واپس ہوئے تھے۔ وہ سفینہ خوشگو میں لکھتے ہیں:

''بعد ازاں اتفاق رفتن بہ سمت دکن افتاد۔ نارسیدہ بہ لشکر واقعۂ بادشاہ غفران پناہ عالمگیر روداد۔'' (۱۱)

مجمع النفائس میں فرماتے ہیں:

''بعد نہ ماہ سفر بہ لشکر مذکور ہمراہ بادشاہزادہ عالی جاہ محمد اعظم شاہ، کہ بعد فوت پدر، بہ تختِ سلطنت نشست، از دکن روانۂ ہندوستان شد۔''

عالمگیر کا فرزندِ اکبر محمد معظم کابل سے لاہور اور دہلی ہوتا ہوا آگرے پہنچ گیا۔ اعظم شاہ نے اہل و عیال اور بھاری ساز و سامان کو گوالیار میں چھوڑا۔ جملۃ الملک اسد خان وزیر اعظم کو نگرانی کے لیے مقرر کر دیا۔ لشکر کا ایک حصہ بھی وہیں ٹھہرا دیا۔ خود آگے بڑھ کر جاجو (نزد دھول پور) کے میدان میں بڑے بھائی سے جنگ کی (جون ۱۷۰۷ء) محمد اعظم شاہ اس جنگ میں مارا گیا اور محمد معظم شاہ بہادر شاہ کے لقب سے شاہنشاہ ہند بن گیا۔

عہد بہادر شاہی:

آرزو اسی لشکر کے ساتھ تھے جو گوالیار میں ٹھہرایا گیا تھا۔ گوالیار ان کا گھر تھا۔ وہ والدہ کے پاس چلے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لشکر میں منصب دار کی حیثیت سے انہوں نے جو تجربہ کیا تھا، وہ سازگار و خوشگوار ثابت نہ ہوا لہٰذا غالباً اس زمانے میں علمی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لیے بہادر شاہ کے عہد میں منصب حاصل کرنے کے بجائے اکبر آباد میں علم حاصل کرنے کے لیے وقف ہو گئے۔

Scanned by CamScanner

منصبداری سے بیزاری کی ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے یعنی قدیم خدمت گزاروں کی قدرومنزلت باقی نہیں رہی تھی اور نئے لوگ معمولی حیثیت سے اٹھ کر صاحب عزوجاہ بن گئے تھے۔ آرزو لکھتے ہیں:

''بہ سبب برہم زدن زمانہ و قدرنشناسی خانہ زادانِ قدیم و پیش آمد نودولتیان چند سال بہ کسب علوم پرداخت۔''

یہ بیان بعض دوسری مستند روایات سے ٹکراتا ہے۔ بلاشبہ مغلوں کے آخری دور میں بعض فرومایہ لوگ صاحب اقتدار بن گئے تھے لیکن اول ایسے اتفاقات قریباً ہر دور میں پیش آتے رہے۔ دوم، یہ بہادر شاہ کے عہد کے واقعات ہیں، جس کے عہد میں عنان اختیار منعم خاں خانخاناں کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے متعلق ارادت خان واضح کا بیان ہے کہ وہ قدیم خدمت گزاروں ہی کو سب پر ترجیح دیتا تھا۔ یہاں تک اعظم شاہ کے ساتھ ہوکر بہادر شاہ کے خلاف لڑتا تمام امیروں کو وہ خود لے کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوتا رہا اور کہتا رہا کہ ان کے سوا سلطنت کا محافظ کون ہوسکتا ہے؟ باقی رہی مخالفت، تو جب تک فیصلہ مبہم رہا، ہر امیر قصد و نیت سے بہ حالات مجبوری اسی شہزادے کا ساتھ دیتا رہا جس کے پاس وہ مقیم تھا۔ فیصلے کے بعد کسی کو بھی مخالفت جاری رکھنا گوارا نہ ہوا۔ پھر ان کا کیا قصور ہے؟ چنانچہ اسد خاں اور اس کے بیٹے ذوالفقار خاں کو پرانے منصب دلائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آرزو نے بہادر شاہ کے عہد میں منصب کی بحالی کے لیے کوشش کی ہو مگر کوئی ایسا وسیلہ میسر نہ آسکا جو انہیں کامیاب بنا دیتا اور ناکامی کے بعد ان کے دل میں یہ وجہ گھر کر گئی کہ قدیم خانہ زادوں کی قدرومنزلت باقی نہیں رہی تھی اور نودولتیے برسرِ اقتدار آ گئے۔

Scanned by CamScanner

تحصیل علوم اور احباب:

تحصیل علم کے متعلق سفینۂ خوشگو میں ان کا بیان ہے:

"پنج سال کتب متداولہ عربیہ را پیش مولانا و مخدومنا شیخ عماد الدین المشتہر بہ درویش محمد قدس سرہٗ گذرانید و دریں بین مشق شعر تیز کرد۔" (۱۲)

یہی پانچ سال کی مدت ہے جس میں آرزو نے علم میں بلند پایہ حاصل کیا اور ان کی مشق شعرگوئی بھی خاصی ترقی کر گئی۔ اس دور کے متعلق فرماتے ہیں:

"اکثر دریں ایام صحبت یاران موزوں مثل شاہ گلشنؔ، مرزا حاتم بیگ حاتمؔ تخلص، میاں عظمت اللہ کاملؔ، محمد مقیم آزادؔ میاں علی عظیم خلف الصدق میاں ناصر علی و دیگر صادر و وارد بہم داد۔" (۱۳)

ان میں سے شاہ سعداللہ گلشن اس دور کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ خوشگو نے لکھا ہے کہ دہلی میں مسجد زینت المساجد دریا کے کنارے فصیل سے ملی ہوئی ہے۔ ہر ہفتے کے روز مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشگو نے اسی مسجد کے لیے لکھا تھا:

اگر آب و ہوای گل زمین شعر خواہی ، بین
فضای مسجد بیگم کنار آب جمنا را (۱۴)

حاتمؔ کو شکستہ نویسی میں کمال حاصل تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں انتقال ہوا (۱۵)۔

عظمت اللہ کاملؔ کا وطن مراد آباد تھا۔ منصب کی آمدنی کم تھی۔ اس کا شکوہ بھی ایک شعر میں کیا ہے:

فلاطوں گر بیاید می شود عاجز بہ تدبیرم
کہ منصب آتشیں داغی شدہ جاگیر جان گیرم (۱۶)

محمد مقیم آزادؔ کا وطن اکبر آباد تھا۔ آخری دور میں بینائی زائل ہو گئی تھی اور نوکری ممکن نہیں

Scanned by CamScanner

رہی تھی، اس لیے غریبی میں زندگی گذاری۔ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں وفات پائی (۱۷)۔

دوسری اور تیسری خانہ جنگی:

پھر والدہ نے آرزو کو گوالیار بلا لیا۔ وہ پہلے بھی آگرہ بہت کم آئی تھیں اور آرزو کے والد کی وفات کے بعد غالباً گوالیار سے کبھی قدم باہر نہ نکالا۔ گوالیار میں والدہ کی مستقل اقامت ہی کی وجہ سے بعض تذکرہ نگاروں نے اس شہر کو آرزو کو دوسرا وطن قرار دے لیا بلکہ بعض نے تو تمام تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں اصلاً گوالیار کا ہی بتایا ہے (۱۸)۔ آرزو لکھتے ہیں:

''حسب الطلب حضرت والدہ بہ گوالیار رفت۔ چند گاہ ماندہ بود کہ بازگردش سلطنت کہ انموذج قیامت است، روداد۔'' (۱۹)

یہ اس خانہ جنگی کی طرف اشارہ ہے جو لاہور میں بہادر شاہ کی وفات (جنوری ۱۷۱۲ء) پر اس کے چاروں بیٹوں میں شروع ہو گئی تھی۔ (محرم ۱۱۲۲ھ مطابق مارچ ۱۷۱۲ء)۔ پہلے معزالدین، رفیع الشان اور جہاں شاہ نے متحد ہو کر عظیم الشان کو ختم کیا۔ پھر رفیع الشان، معزالدین سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سب سے آخر میں جہاں شاہ کی باری آئی۔ معزالدین کامیاب ہوا جو چاروں بھائیوں میں نالائق ترین تھا۔ وہی جہاندار شاہ کے لقب سے شاہنشاہ ہند بنا۔

آرزو گوالیار سے آگرہ پہنچے تو عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر، عبداللہ خاں اور حسین علی خاں (سادات بارہہ) کو ساتھ لے کر باپ کے انتقام اور سلطنت کی بازیافت کے لیے عظیم آباد سے آگرے پہنچ گیا تھا۔ وہیں جہاندار شاہ سے جنگ ہوئی جو شکست کھا کر دہلی بھاگ گیا۔ فرخ سیر نے دہلی پہنچ کر جہاندار شاہ کو نیز ذوالفقار خاں کو قتل کرا دیا جو جہاندار کی کامیابیوں کا ذمہ دار تھا اور خود تخت سنبھال لیا (محرم ۱۱۲۵ھ مطابق فروری

Scanned by CamScanner

۱۷۱۴ء) عالمگیر کی وفات کے بعد چھ سال میں یہ مغلوں کی تیسری خانہ جنگی تھی۔ گویا وہ انجام سے بالکل بے پروا ہو کر اس سلطنت کی بنیادیں منہدم کر ڈالنے میں سرگرم ہو گئے جس کے استحکام و توسیع کے لیے بابر کے بعد اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی پوری عمریں صرف ہو چکی تھیں۔

متفرق واقعات:

آرزو کی عمر اس وقت کم و بیش چھبیس برس کی ہو گی۔ پھر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے اور علمی زندگی اختیار کر لینے تک (۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۲۰ء) کے حالات زیادہ واضح نہیں۔ آرزو کی تحریرات سے جو کچھ معلوم ہو سکا اس کی سرسری کیفیت درج ذیل ہے:

۱۔ وہ فرخ سیر کے دور حکومت کی ابتداء میں (۱۷۱۳ء) ملازمت کے لیے دہلی پہنچے اور ان کے لیے گوالیار سے متعلق کوئی انتظام کر دیا گیا جس کی تفصیل نہیں مل سکی۔ یہ انتظام خود آرزو کی خواہش کے مطابق ہوا ہو گا کیونکہ گوالیار ان کے لیے والدۂ ماجدہ کے قیام کی وجہ سے دوسرا وطن بن گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یوں مزید چھ سال وطن ہی میں گذرے اور اس زمانے میں شعر کہنے کا اتفاق کم ہوا (۲۰)۔

۲۔ پھر سادات کا تسلط ہوا یعنی فرخ سیر کے عزل و قتل کے بعد سادات مختار کل بن گئے تو آرزو کی ملازمت میں بھی تغیر آ گیا اور وہ اکبر آباد پہنچ کر اس شاہی لشکر سے مل گئے جو نیکوسیر کا ہنگامہ رفع کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا (۲۱)۔

نیکوسیر شہزادہ اکبر کا بیٹا اور عالمگیر کا پوتا تھا جو قلعۂ آگرہ میں نظر بند تھا۔ فرخ سیر کی معزولی پر افراتفری پھیلی تو آگرہ کی فوج نے نیکوسیر کو نظر بندی سے نکال کر شاہ جہان ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا لیا۔ سادات بارہہ نے حیدر قلی خاں کو یہ ہنگامہ ختم کرنے کے لیے بھیجا تھا [illegible]

۳۔ آخر آرزو کو گوالیار میں سوانح نگاری پر مامور کر دیا گیا لیکن یہ سلسلہ دو مہینے سے زیادہ نہ چل سکا کیونکہ قطب الملک عبداللہ خاں اور امیرالامرا حسین علی خاں یکے بعد دیگرے مارے گئے۔ ان کی صف اقتدار لپیٹی گئی، ساتھ ہی ان کے کیے ہوئے انتظامات بھی کالعدم ہو گئے۔

دہلی میں قیام:

اب آرزو نے فیصلہ کر لیا کہ شاہجہان آباد میں مقیم ہو کر علمی زندگی بسر کی جائے۔ چنانچہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق ۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۲۰ء میں وہ شاہجہان آباد پہنچ گئے (۲۲)۔

سید صاحب فرماتے ہیں:

''صحبت او با انند رام مخلص بناء برجنسیت موزونی گیرا افتاد۔ مخلص برای او منصبی و جاگیری از سرکار بادشاہی گرفت و خدمتی بسیاری از خود تقدیم رساند و موتمن الدولہ اسحاق خاں نیز بہ قدردانی او پرداخت۔'' (۲۳)

بظاہر خان آرزو کے علم وفضل و نیز شاعری میں شہرت کی برکت تھی۔

''سفینۂ خوشگو'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منصب ہفت صدی تھا۔ نیز جاگیر وطن میں ملی تھی۔ وطن سے مراد آگرہ بھی ہو سکتا ہے اور گوالیار بھی۔ سفینہ مذکورہ کا بیان ہے کہ یہ جاگیر غنیم دکن کی پامالی میں ختم ہو گئی یعنی مرہٹہ گردی میں جاتی رہی (۲۴)۔ غالباً اس وقت تک آرزو کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا کیونکہ پھر کہیں ان کا ذکر نہیں آیا۔

موتمن الدولہ اسحاق خاں نے آرزو کے لیے ڈیڑھ سو روپیہ مہینا الگ مقرر کر دیا تھا۔ یہ رقم موتمن الدولہ کے فرزند نے بھی بدستور جاری رکھی۔ آرزو حقیقتاً اس خاندان کے

Scanned by CamScanner

ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موتمن الدولہ کا چھوٹا بیٹا مرزا محمد علی سالار جنگ حالات کی ابتری کے باعث دہلی چھوڑ کر اودھ گیا تو آرزو کو بھی ساتھ لے گیا۔ آرزو خود اصلاً اودھ ہی کے رہنے والے تھے کیونکہ ان کے جدامجد کمال الدین کا وطن اودھ ہی تھا۔ ممکن ہے اس زمانے میں ان کے ہم خاندان وہاں موجود ہوں۔

آرزو نے وکیل پورہ سے باہر ایک مکان کا انتظام کر لیا تھا جو انند رام مخلص کے مکان سے متصل تھا۔ وہیں تمام احباب جمع ہوتے تھے۔ مخلص اور آرزو تو اکثر اکٹھے رہتے تھے (۲۵)۔ لیکن خان آرزو، موتمن الدولہ اسحاق خان کے ہاں جاتے تو کئی کئی مہینے وہاں گذار دیتے تھے (۲۶)۔

میں نے وکیل پورہ کی تلاش میں بڑی سرگرمی سے کام لیا لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ دہلی میں کس جگہ واقع تھا اگر پتا چل سکتا تو ہم آرزو کے مکان کا سراغ نکال لیتے۔ بظاہر وکیل پورہ سے مراد وہ آبادی ہو گی جہاں مختلف صوبوں اور علاقوں نیز مختلف سلطنتوں کے وکیل یا سفیر مقیم تھے جنہیں آج کل کی اصطلاح میں ''ڈپلومیٹک کور'' کہتے ہیں۔

علمی اشتغال و انہماک:

آرزو نے ۱۱۳۲ھ (مطابق ۱۷۲۰ء) سے اواخر ۱۱۶۷ھ (اکتوبر ۱۷۵۴ء) تک کم و بیش پینتیس سال مسلسل اس طرح گذارے کہ خدمت علم کے سوا کسی مشغلے کی طرف توجہ نہ کی۔ ان کے ہاں قدیم اساتذہ کی طرح درس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کی قیام گاہ یا بعض دوسرے مقامات پر مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ علمی مجلسیں بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ بیشتر تصانیف بھی اس دور میں ہوئیں اگرچہ دہلی امن گاہ نہیں رہی تھی اور وہاں آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھتا ہی رہتا تھا۔ نادرشاہ ایرانی کا قیامت خیز حملہ بھی اسی دور میں ہوا جس میں صدیوں کا جمع کیا ہوا سونا چاندی، جواہرات، تخت جو تعداد میں نو تھے اور ان میں

Scanned by CamScanner

تخت طاؤس بھی شامل تھا جیسا تخت دنیا کے کسی بادشاہ کو نصیب نہ ہوا۔ زینت کی ہر قیمتی شے بلکہ تلواریں، گھوڑے، نادر پارچے اور نوادر بھی دہلی سے ایران پہنچ گئے اور نادر شاہ کے قتل کے بعد سب کچھ اسی طرح ہاتھوں ہاتھ بٹ گیا جس طرح نادر شاہ لوٹ کر لے گیا تھا، تاہم آرزو کی دل جمعی اور فارغ البالی میں کوئی فرق نہ آیا۔ گذر اوقات کے وسائل انہیں میسر تھے اور انہوں نے علم و ادب کی خدمت کے سوا کسی دوسری چیز سے سروکار نہ رکھا۔ سفینۂ خوشگو کا بیان ہے:

''دو سال صبح و شام بر ملازمت بادشاہ زمان می رفتند۔ در ہر مقام مناسب آنجا سخن می آوردند۔ چنانچہ روزی بادشاہ برتخت روانِ شیشہ سوار بود، ایشان (آرزو) ایں رباعی بدیہہ برخواندند:

درخدمت بادشاہ چندین جمشید
دامن بہ میان برزدہ از روی امید
بنشست شہنشاہ سکندر طالع
برتخت روانِ آئنہ چون خورشید (۲۷)

موتمن الدولہ اور ان کے فرزند:

موتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری نے امرائے دہلی میں سے خان آرزو کی خدمت بطور خاص اپنے ذمہ لے لی تھی اور اس کے بیٹوں نے بھی اس خدمت میں کوئی خلل نہ آنے دیا۔ اسحاق خاں، محمد شاہ کے دور کا مشہور امیر تھا۔ اس کا والد شوستر سے ہندوستان آیا تھا۔ خود اسحاق خاں دہلی میں پیدا ہوا۔ غالباً کچھ عرصے تک محمد شاہ کی اتالیقی بھی کی تھی اسی لیے نادرشاہ سے دو مرتبہ ملاقات میں محمد شاہ صرف اسحاق خاں کو ساتھ لے گیا تھا اور اس کی گفتگو سے نادرشاہ بھی متاثر ہوا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں

کہ اسحاق خاں:

''درکسب کمال پرداخت و از مستعدان عصر برآمد۔ خوش فہم و دقیقہ سنج بود۔ درنظم ونثر عربی و فارسی دست بالا داشت و در ہر سلطنت بااعتبار زیست۔ خصوصاً دراواسط عہد فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کمال تقرب سلطان بہم رساند۔'' (۲۸)

سیرالمتاخرین کا بیان ہے کہ عمدۃ الملک امیر خاں الہ آباد کی صوبہ داری پر چلا گیا تو موتمن الدولہ کا تقرب اوج آسمان پر پہنچ گیا اور بادشاہ کے نزدیک وہ امرا میں سب سے زیادہ محبوب تھا۔

''دیوانی خالصہ شریفہ بہ او مرجوع گشتہ۔ چندیں ہزار سوار و رسالۂ او ملازم سرکار بادشاہ بودند۔ اعتباری کہ بادشاہ را بر او بود، بر ہیچ امیری نہ داشت۔''

اسحاق خاں نے چند روزہ علالت کے بعد صفر ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) میں وفات پائی۔ طباطبائی لکھتے ہیں:

''بثوری چند در بینی او بہم رسیدہ، ورم و آماسی نمود و پنج شش روز تپی عارض گشت ناگہاں روز دوشنبہ ۱۲ صفر سنہ مذکور (۱۱۵۳ھ) جہان فانی را وداعی گفتہ بہ رحمت الٰہی پیوست۔'' (۲۹)

اسی کی صاحبزادی کو اپنی بیٹی بنا کر محمد شاہ نے شجاع الدولہ (بن صفدر جنگ) نواب وزیر اودھ سے بیاہ دیا تھا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کو حاصل ہوا۔

موتمن الدولہ کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے نجم الدولہ کو باپ کی جگہ مل گئی۔ پھر موتمن الدولہ اور اسحاق خان کے خطاب بھی اسے دے دیئے گئے۔ اس نے صفدر

Scanned by CamScanner

جنگ اور بنگش خاندان کی جنگ میں اول الذکر کا ساتھ دیا کیونکہ صفدر جنگ کا قریبی رشتہ دار تھا اور اسی جنگ میں مارا گیا۔

نجم الدولہ یا اسحاق خاں دوم نے خان آرزو کی قدر شناسی میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ والد کے زمانے کا مقررہ وظیفہ برابر پہنچاتا رہا، چنانچہ آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے:

''اکنوں سیزدہ سال است کہ اکثر اوقات صرف خدمت و صحبت نواب نجم الدولہ کہ ستارۂ عمر و دولتش بر اوج اقبال روز افزون باد، می نماید۔''

ظاہر ہے کہ ''مجمع النفائس'' کا یہ حصہ نجم الدولہ کی زندگی مین لکھا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ میدان جنگ میں جاں بحق ہوا۔

آخری دور:

محرم ۱۱۶۸ھ (مطابق نومبر ۱۷۵۴ء) میں عمادالملک نے وزارت سنبھال لی اور دربار شہی ہی کے نہیں، شہر دہلی کے حالات بھی ابتر ہو گئے۔ اسحاق خاں کے چھوٹے بیٹے یعنی نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا محمد علی سالار جنگ دہلی سے اودھ چلے گئے اور خان آرزو کو بھی ساتھ لے گئے۔ آرزو کی ملاقات صفدر جنگ سے کرا دی گئی تھی لیکن وہ کوئی انتظام کرنے سے پیشتر ہی فوت ہو گیا اور شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ بنا۔ اس نے آرزو کے لیے تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

سالار جنگ کے ساتھ اودھ جانے کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ آرزو کے لیے دہلی میں بہ اطمینان وقت گذارنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی اور موتمن الدولہ کے خاندان کے سوا آرزو کا حقیقی قدرشناس کوئی نہ تھا، ورنہ وہ کسی بھی حالت میں دہلی چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے۔

Scanned by CamScanner

بہرحال آرزو کی زندگی کے آخری چودہ مہینے فیض آباد میں بسر ہوئے کیونکہ اس زمانے میں نواب وزیر اودھ کا مرکز حکومت فیض آباد ہی تھا اسی کو اودھ کہتے تھے۔ لکھنؤ آصف الدولہ کے عہد میں مرکز بنا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

''چوں وقت انتقال قریب رسید، بہ بلدۂ لکھنؤ آمد و بست و سوم ربیع الثانی سنہ تسع وستین و مآۃ الف بجوار رحمت حق پیوست۔ اول اورا در لکھنؤ امانت گذاشتند و بعد چندگاہ بقیہ جسد او را بہ شاہجہان آباد بردہ دفن کردند۔''(۳۰)

مفتاح التواریخ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

''چوں وقت او بہ آخر رسید، بہ لکھنؤ آمد و درآنجا بست و سوم شہر ربیع الثانی سنہ ہزار و یک صد و شصت و نہ درگذشت، چندگاہ بہ لکھنؤ بہ خاک سپردہ شد۔ بعد ازاں برادر زادۂ او محمد حسن خاں تابوتش را بہ دہلی بردہ درآنجا دفن ساخت۔''(۳۱)

کوئی وجہ نہیں بتائی گئی کہ آرزو آخری وقت میں لکھنؤ کیوں آئے؟ مجھے یقین ہے کہ جب ان پر واضح ہو گیا کہ صحت یابی کی کوئی امید نہیں تو انہوں نے وفات سے قبل دہلی پہنچ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سفر اسی غرض سے اختیار کیا گیا تھا اگرچہ یہ بڑی جسمانی کوفت کا باعث تھا۔ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے تو بیماری اتنا غلبہ پا چکی تھی کہ مزید سفر ممکن نظر نہ آیا، لہٰذا وہیں ٹھہر گئے کہ ذرا افاقہ ہو تو سفر شروع کر دیں لیکن وقت لکھنؤ ہی میں پورا ہو گیا۔ وصیت فرما دی تھی کہ انہیں دہلی میں دفن کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں امانتہً دفن کیا گیا۔ پھر ان کے بھتیجے محمد حسن خاں نے تابوت دہلی پہنچا کر دفن کیا۔

ہمیں خان آرزو کے کسی بھائی کا علم نہیں جس کا بیٹا محمد حسن خاں تھا۔ ممکن ہے وہ اقربا میں سے کوئی ہو، لیکن ولیم بیل مؤلف ''مفتاح التواریخ'' خود آگرے کا باشندہ تھا

Scanned by CamScanner

اور آرزو کے حالات میں اس سے مستند تر روایت کسی کی نہیں ہو سکتی۔ میت لے جانے والے کا نام بھی اسی نے لکھا ہے اور کسی کتاب میں یہ نام نہیں آیا۔ ممکن ہے شیخ حسام الدین نے پہلے آگرے میں کوئی شادی کی ہو اور اس سے اولاد بھی ہو۔ پھر قیام گوالیار میں والدۂ آرزو سے شادی کر لی ہو۔

اکثر معاصرین نے بھی آرزو کی وفات کے قطعات تاریخ کہے ہوں گے۔ ہمیں صرف دو قطعوں کا علم ہو سکا اور وہ دونوں میر غلام علی آزاد بلگرامی کے ہیں:

خان والا شان سراج الدین علی — شمع رونق بخشِ بزمِ گفتگو
زد رقم آزاد سال رحلتش — رحمت کامل بہ روحِ آرزو (۳۲)

سراج الدین علی خان نادرالعصر — نہ مرگ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسی سال وفاتش — بگو آن جان معنی آرزو رفت (۳۳)

شخصیت:

آرزو کے علم و فضل، حسن اخلاق اور استادی کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ عبدالحکیم حاکم لاہوری ''مردم دیدہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''عزیز صاحب کمال و شاعر شیریں مقال، بہ وسعت مشرب موصوف، بی ساختہ و بی تعین کسی بود۔ اخلاق حمیدہ و صفات ستودہ داشت۔ در کتاب دانی و اصطلاحات و لغات بی نظیر۔'' (۳۴)

پھر فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض سخن فہم آرزو کی زبان کے منکر ہیں:

> ''لیکن شعر انتخابی او اگر جمع کردہ شود، دیوانی می شود سراپا موثر و پُر درد۔'' (۳۵)

میر غلام علی آزاد نے خزانہ عامرہ میں آرزو کو ''سراج الشعرا'' اور ''طراز الفصحا'' قرار

Scanned by CamScanner

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے ''نگارستان فارس'' میں لکھا ہے:

''ایسا شاعر، ساتھ اس کے محقق زبان فارسی کا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ کلام ان کا بہ موجب اصول اہل زبان کے نمکین اور رنگین ہوتا ہے۔ صاحب تصنیف اور کثیر التالیف تھے۔ علاوہ شاعری کے زبان کی تحقیق سے ان کو ایک مناسبت خداداد تھی۔'' (۳۶)

لیکن آزاد کی کوئی مدح، قدح کی آمیزش سے شاید ہی پاک ہو۔ چنانچہ آگے چل کر ''تنبیہ الغافلین'' کا ذکر لے آئے ہیں جو آرزو نے شیخ علی حزیں کے خلاف لکھی تھی۔ فرماتے ہیں:

''اور ایک امر نازیبا ہے کہ انہوں (آرزو) نے اور ایک صاحب کمال (حزیں) کے کمال کو مٹایا یا خود دعویٔ کمال کیا مگر کچھ جھوٹ بھی نہیں کیا، کیونکہ وہ خود مرد قابل تھا اور ایسے دعوے کے لائق تھا البتہ تعصب یا تعلّی جو کہ مقتضائے بشریت یا لازمۂ شعرا اور اہل علم ہے، وہ ہے۔'' (۳۷)

اہل علم و ادب میں سے شاید ہی کوئی ہو جس نے آرزو کا ذکر زیادہ سے زیادہ احترام سے نہ کیا ہو۔ سب رائیں تو یہاں درج نہیں ہو سکتیں۔ صرف مندرجہ ذیل آراء کا اندازہ فرما لیجیے:

۱۔ مصحفی ''عقد ثریا'' میں لکھتے ہیں:

''موطن قدیم بزرگانش صوبۂ اودھ است۔ در عہد خویش از ہمگنان برآمدہ؛ وزیں جہت از حضورِ بادشاہ دین پناہ بہ خطاب ملک الشعرا سرفرازی یافتہ ..... از تصانیفش شتر بار بر صفحۂ روزگار یادگار ماند ..... در حالت احتضار بود کہ یکے از مشتاقین رسیدۂ گفت کہ من از مدت

Scanned by CamScanner

آرزوی قدم بوسی شما داشتم۔ گفت امروز آرزوی شما تمام می شود۔''(۳۸)

۲۔ سید فتح علی حسین گردیزی فرماتے ہیں:

''دیوانی ضخیمی با قصاید غرا جمع نمودہ۔ تمام دیوان فغانی و سلیم را جواب گفتہ ..... در جواب محمود و ایاز زلالی مثنوی بہ شور عشق دارد و در آن تلاش ہای بسیار کردہ ..... در دہلی غیر از صرف اوقات در تحصیل و افادہ طلبۂ علم نصب العین او نیست۔''(۳۹)

۳۔ ''مخزن نکات'' میں قائم کا بیان ہے:

''بالفعل در فضیلت و کمال فوقش متصور نیست۔ حق تعالیٰ سلامتش داراد و زیاد برین از کمالات آن بزرگوار مثل من ہیچ مدان چہ نویسد کہ شمارِ قطرہ آب باران کردن و سیاحت افلاک پیمودن است۔(۴۰)

۴۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی:

''از شعراء حال و تازہ گویانِ خوش خیال است۔ قریب پنجاہ سال است کہ درگلستان سخن عندلیبی می کند و بہ دستیاری ثعبانِ قلم بازار سحر آفرینان می شکند۔''(۴۱)

۵۔ تذکرۂ حسینی:

''شمع شبستان اقسام گفتگو، سراج الدین علی خان آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ..... سخنش لآلی آب دار، صاحب تصنیفات نامی و تالیفات گرامی است۔ امروز در دارالخلافہ شاہجہان آباد در فن شعر و دیگر علوم کوس استادی می زند۔''(۴۲)

Scanned by CamScanner

تصانیف:

خان آرزو کی عظمت کا اندازہ ان کی تصانیف. سے بھی ہو سکتا ہے،،جن کی فہرست خاصی طویل ہے اور ان میں خاص تنوع ہے۔ مثلاً

۱۔ دیوان غزلیات و قصائد (پچیس ہزار بیت۔ بعض اصحاب نے غزلیات فارسی کے دو حصے کر لیے ہیں۔ ایک کا نام ہے بہ طرزِ فغانی اور دوسرے کا نام ہے بہ طرز کمال خجندی۔[آرزو کے دو دیوان اور بھی ہیں ایک بہ طرز دیوان شفیعای اثر شیرازی اور دوسرا بہ طرز دیوان سلیم تہرانی (ریحانہ خاتون،ڈاکٹر:احوال و آثار سراج الدین علی خان آرزو،ص ۱۰۵)]

۲۔ سراج اللغت (لغات قدیم فارسی)

۳۔ چراغ ہدایت (لغات و مصطلحات متاخرین)

۴۔ خیابان (شرح گلستان)

۵۔ شرح قصاید عرفی

۶۔ شرح سکندر نامہ [اس کا نام ''شگوفہ زار'' ہے (ریحانہ خاتون، ڈاکٹر،ص ۱۴۰)]

۷۔ مولانا محمد حسین آزاد نے شرح ''زلیخا'' کا بھی ذکر کیا ہے۔

۸۔ موہبت عظمیٰ (علم معانی میں)

۹۔ عطیہ کبریٰ (علم بیان میں) ان دونوں کتابوں میں مثالیں فارسی کی دی ہیں۔

۱۰۔ مثمر۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے قواعد فارسی میں، بعض اصحاب نے اس کا موضوع بلاغت و معانی بتایا ہے۔

۱۱۔ نوادر الالفاظ (ان ہندی لغات کی کتاب جن کی عربی اور فارسی غیر مشہور تھی)

۱۲۔ شرح قصیدہ ابوالبرکات منیر کہ بر اعتراضات شیدا بر قصیدۂ قدسی نمودہ [مراد رسالہ دادسخن ہے (عارف نوشاہی،ڈاکٹر، مجلّہ پیغام آشنا، شمارہ:۲۳،

Scanned by CamScanner

سال ۲۰۰۵، ص ۱۴۴)]

۱۳۔ سراج منیر (عرفی اور تین دوسرے شاعروں پر منیر کے اعتراضات کا جواب)
[یہ شاعر طالب، زلالی خوانساری اور ظہوری ترشیزی ہیں (عارف نوشاہی، ڈاکٹر، مجلّہ پیغام آشنا، ض ۱۴۵)]

۱۴۔ سراج وہاج (خواجہ حافظ کی ایک بیت کے متعلق شاعروں کی بحث پر محاکمہ)

۱۵۔ مثنوی محمود و ایاز مسمی بہ حسن و عشق (در جواب زلالی) [اس مثنوی کا نام ''حسن و عشق'' کی بجائے ''سوزِ عشق'' ہے (ریحانہ خاتون، ڈاکٹر، ص ۱۰۵)]

۱۶۔ ساقی نامہ مسمیٰ بہ عالم آب

۱۷۔ ایک مثنوی غیر متعارف بحر میں [اس مثنوی کا نام ''مہر و ماہ'' ہے (ریحانہ خاتون، ڈاکٹر، ص ۱۰۶)]

۱۸۔ مثنوی جوش و خروش

۱۹۔ ایک مثنوی حدیقۂ سنائی کی بحر میں [اس مثنوی کا نام ''عبرتِ فسانہ'' ہے جو علی قلی سلیم کی مثنوی ''قضا و قدر'' کے جواب میں کہی گئی (ریحانہ خاتون، ڈاکٹر، ص ۱۰۶)]

۲۰۔ رباعیات، مخمسات، ترکیب بند، ترجیع بند اور مقطعات تاریخ

۲۱۔ رقعات مسمیٰ بہ پیام شوق

۲۲۔ نثرہای متفرقہ

۲۳۔ تنبیہ الغافلین

۲۴۔ مجمع النفائس

یہ فہرست مختلف کتابوں سے جمع کی گئی ہے۔ غالباً اتنی جامع فہرست آج تک یکجا نہیں ہوئی۔ ممکن ہے آرزو کے اور رسالے بھی ہوں جو کسی فہرست میں نہیں آئے

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے آرزو کی ایک اور کتاب کا نام ''شرح گل کشتی'' لکھا ہے جو میر عبدالعال نجات کی مثنوی ''گل کشتی'' کی شرح ہے (ص ۱۴۱)] تاہم یہ فہرست بھی کچھ کم اہم نہیں اور ان میں سے ہر کتاب کی حیثیت علمی ہے۔

تنبیہ الغافلین:

''تنبیہ الغافلین'' پر بحث کا یہ محل نہیں نیز اس پر گفتگو خاصی طوالت کی محتاج ہے لیکن مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے بیان سے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خود ان کے پائے کے عالم اور حقائق فہم بزرگ بھی اس کتاب کے پس منظر اور محرکات سے یا تو آگاہ نہیں ان محرکات کو نظرانداز کر گئے؛ اس لیے اختصاراً یہ پس منظر بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ آرزو کی اس کتاب کے متعلق منصفانہ اور متوازن رائے قائم کی جا سکے۔ مغلوں کے دور میں بے شمار ایرانی، شاعر، ادیب، طبیب، مدبر، سالار، حکیم وغیرہ یہاں آئے جن کے لیے یا تو ایران کی فضا کسی وجہ سے ناسازگار ہو گئی تھی یا ان کے فطری جوہروں کی نمائش کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہاں انہوں نے بلند منصب حاصل کیے، بے اندازہ دولت جمع کی اور وطن لوٹ گئے تاہم ان میں سے بیشتر ہندوستان کی مذمت ہی کرتے رہے۔ بعض اکابر نے ستائش بھی کی۔ لطف یہ کہ مذمت کرنے والوں کو جب روپے کی ضرورت ہوتی تو پھر بے تکلف چلے آتے۔

نظیری کا واقعہ:

نظیری کا واقعہ خاصہ عبرت انگیز ہے۔ وہ بہ اعتبار پیشہ زرگر تھا، لیکن شاعری خصوصاً غزل میں قدرت نے اسے بہت بلند مرتبہ عطا کیا تھا۔ وہ یہاں آیا۔ خانخاناں نے ... جہانگیر نے تین ہزار بیگھے زمین دے دی۔

احمد آباد میں ایک عالی شان عمارت بنوا کر رہنے لگا۔ اس کی زرگری کا کارخانہ بھی جاری تھا۔ ایران میں وہ ایسی دولت مندی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا تاہم جب اس کے بیٹے نورالدین محمد کا انتقال ہوا تو اس نے مرثیہ میں لکھا:

بہتر کہ اصل و نسل بہ خاک وطن بریم
حق مہرباں کند دل عباس شاہ را

خیر یہ تو ایک دردناک صدمے کا وقت تھا اور ایسے اوقات میں انسان کی طبیعت بے اختیار خویشوں کی طرف پلٹ جاتی ہے لیکن ایک غزل میں اس نے حبِ وطن کے جذبے کا اظہار ایسے رنگ میں کیا ہے جس سے صریحاً کفرانِ نعمت کی بو آتی ہے:

اخراج مغل خواہم و تاراج قزلباش
کز ہند برندم بہ نشاپور فروشند

یعنی فرماتے ہیں: اب میں چاہتا ہوں کہ ایرانی قزلباش ہندوستان پر حملہ کریں۔ مغلوں کو یہاں سے نکال دیں۔ مجھے پکڑ کر لے جائیں اور نیشاپور میں غلام بنا کر بیچ ڈالیں۔

حالانکہ نظیری جب چاہتا، وطن جا سکتا تھا اور اسے کسی نے نہ روکا تھا۔ صرف دولت کی زنجیر اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھی اور وطن کی طرف جنبش نہیں کرنے دیتی تھی۔ لہٰذا وطن پہنچنے کی انوکھی ترکیب سوچی۔ یہاں کے لوگ ایرانی شاعروں کی ایسی باتوں کو محض سخن گستری قرار دے کر ٹالتے رہے۔

شیخ علی حزیںؔ نہایت رنج دہ اور پریشان کن حالات میں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ گئے تو ان کے لیے شاہانہ مصارف کا انتظام ہو گیا لیکن وطن جانے کی کوئی صورت نہ رہی، کیونکہ نادر شاہ ایران پر مسلط ہو گیا تھا۔ اقربا و احباب سے الگ، ماحول اجنبی اور شیخ حد درجہ نازک مزاج آدمی۔ وہ مسلسل ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مذمت کرتا رہا اور بعض شعر واقعی بے حد دل آزار تھے۔ ان حالات پر خان آرزو کو جوش آیا

Scanned by CamScanner

"تنبیہ الغافلین" لکھ دی۔ ان کا مقصود غالباً محض یہ تھا کہ ایرانی جن کمالات پر نازاں ہیں اور ہندوستانیوں سے تکبر کا برتاؤ کر رہے ہیں، خود ان کے کمالات بھی ایسے نہیں جو خامیوں سے بالکل پاک ہوں چنانچہ حزین کے شعروں پر اعتراضات کیے۔ یہاں یہ بحث چھیڑنا منظور نہیں کہ وہ صحیح تھے یا نہ تھے۔ اغلب ہے اکثر صحیح نہ ہوں تاہم قطعاً شبہ نہیں کہ اگر حزیں کے شعروں میں کہیں کوئی خامی بھی نکل آئے تو اس کے درجے اور رتبے پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ بہتر ہوتا کہ خان آرزو شیخ حزیں کے مصائب پیش نظر رکھتے اور صبر سے کام لیتے افسوس کہ وہ صبر نہ کر سکے۔ مصحفی نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایں قصہ خود مشہور است۔ چوں نیک دیدہ شد، ایں ہمہ شورش او

برائے ظاہر بود و الاّ مرتبۂ شیخ را او ہم مے فہمد۔" (۴۳)

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آرزو کی شورش محض ظاہری حیثیت رکھتی تھی کیونکہ "مجمع النفائس" میں کئی مقامات پر حزیں کا ذکر لے آئے ہیں اور اس میں کوئی نہ کوئی کلمہ خلاف ضرور لکھا ہے، جس سے اک گونہ دلی رنج معلوم ہوتا ہے، تاہم حزیں کے مرتبے کو آرزو سے بہتر اس دور میں کون سمجھ سکتا تھا۔

<u>مجمع النفائس:</u>

یہاں ہم "مجمع النفائس" کے متعلق ضروری معلومات جمع کرنا چاہتے ہیں جس کا یہ مقدمہ ہے۔ آرزو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ابتدا ہی سے اچھے شعر یاد رکھنے کی عادت تھی، لیکن کچھ مدت کے بعد ان میں سے کئی شعر بھول گئے۔ یہ ذکر ایک دوست سے کیا تو اس نے ایک رجسٹر لا کر پیش کر دیا کہ جو اچھا شعر ملاحظے میں آئے۔ اسے اس رجسٹر پر لکھتے جائیے۔ اس طرح "مجمع النفائس" کی بنیاد پڑ گئی اور یہ کتاب قریباً مدت العمر زیر تالیف رہی۔

Scanned by CamScanner

آرزو نے متوسطین و متاخرین کے کوئی ایک سو دیوان دیکھے۔ تقی اوحدی، نصر آبادی، کلمات الشعراء، تحفۂ سامی وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا:

''چوں غرض اصلی نوشتن اشعار دل پسند خود است و نوشتن حالات تبعی، لہٰذا در تحقیق آں چنداں نکوشیدہ و در تلاش آں چنداں نہ دویدہ۔''(۴۴)

پھر فرماتے ہیں کہ مشغولیتیں بہت زیادہ تھیں اور ایک فرد کے سوا کوئی شخص ہاتھ بٹانے کے لیے بھی میسر نہ تھا۔

''باوجود کثرت مشاغل و عدم معاون غیر از یک کس کہ عبارت است از عزیز دلہا و منتخب دنیا و مافیہا، شیخ مبارک محی الدین رزقہ اللہ البرکۃ فی العمر آنچہ دست بہم داد، بہ قید قلم در آوردم و دریں صورت اگر تفاوتی یا غلطی بہ نظر خوانندگاں درآید، عزیزان منصف خُردہ برمن نہ گیرند۔''(۴۵)

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے فرمایا ہے کہ مجمع النفائس ۱۱۶۴ھ میں مکمل ہو گئی یعنی ۱۷۵۱ء میں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ آرزو غالباً آخر تک اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ میر آزاد نے اس کا ایک نسخہ دیکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''در جمیع اشعار آبدار و انتخاب دواوین اہتمام عظیم بہ کار بردہ۔''(۴۶)

مزید فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس میں شاعروں کے حالات نہیں لکھے، تاریخ ہائے ولادت و وفات کے اندراج کا بھی اہتمام نہیں کیا اور تحریر میں ترتیب زمانی بھی ملحوظ نہیں رکھی تاہم:

''ظاہر است کہ فرق در بیاض و تذکرہ ہمیں باشد کہ بیاض تنہا اشعار شاعر دارد و تذکرہ احوال و اشعار ہر دو دارد لیکن خود در دیباچہ و خاتمۂ کتاب عذر ایں معنی بری گمارد و مع ہذا در ضمن عبارات صاف و بے

Scanned by CamScanner

تکلف لطائف و تعبیرات تازہ یا برخی فوائد مندرج ساختہ۔ ازین
سبب کتاب او را کیفیت خاص بہم رسیدہ شکر اللہ سعیہ۔" (۴۷)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ "مجمع النفائس" نے ایک نئی شکل اختیار کر لی جو بیاض و تذکرہ کے درمیان تھی۔ یعنی اس میں محض اشعار نہیں بلکہ شاعروں کے جتنے بھی حالات مل سکے درج کر دیے جن کے متعلق کچھ نہ ملا، صاف لکھ دیا کہ اس کا حال معلوم نہیں، البتہ کسی کے متعلق چھان بین بھی نہیں کی اور ترتیب کا خاص اہتمام بھی کتاب میں نظر نہیں آتا۔ اس طرح یہ کتاب بیاض سے آگے نکل گئی۔ تاہم چونکہ تذکرے کی طرح اس میں نہ ترتیب زمانی ملحوظ رکھی نہ سنین کا کوئی اہتمام نظر آتا ہے، اس لیے اسے تذکرہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ قطعاً شبہ نہیں کہ اس میں چودہ سو اور پندرہ سو کے درمیان شعرا کا کلام جمع ہو گیا ہے اس لیے یہ بڑا اچھا ذخیرہ ہے اور اتنے اشعار کا مجموعہ بہ آسانی ہر جگہ نہیں مل سکتا اگرچہ یہ مجموعہ تذکرے کی منزل پر نہ پہنچا ہو۔

البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے اندازے کے مطابق آرزو کا ذوق شعر بہت اچھا نہیں اور اس کا سرسری اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کا انتخاب پہلے "مجمع النفائس" میں دیکھ لیجیے پھر اسی کے اشعار کسی دوسرے تذکرے میں ملاحظہ فرما لیجیے۔ دوسروں کے پانچ دس اشعار، شاعر کے متعلق اچھا تصور پیدا کر دیں گے۔ لیکن آرزو کے بیس یا زیادہ اشعار بھی کوئی قابل توجہ تصور پیدا نہ کر سکیں گے۔

چند خصوصیتیں:

آرزو کی چند خصوصیتیں ہیں جنہیں وہ شاذ ہی چھوڑتے ہیں مثلاً

۱۔ میرے اندازے کے مطابق انہوں نے "خط" کے متعلق کسی شاعر کا شعر شاید ہی نظر انداز کیا ہو یا اسے پورے اہتمام سے نہ لکھا ہو۔

Scanned by CamScanner

۲۔ جس پر اعتراض مقصود ہو یا اس میں آرزو کے نقطۂ نظر سے اصلاح کی گنجائش ہو، وہ ضرور انتخابی اشعار میں لاتے ہیں۔ بعض مقامات پر ان کی اصلاح نے شعر کا مرتبہ واقعی خاصا بلند کر دیا ہے لیکن اکثر مقامات پر ان کی اصلاحیں محض لفظی مناسبتوں کی بنا پر مستحق توجہ سمجھی جا سکتی ہیں۔

۳۔ عجیب امر یہ ہے کہ خود اپنے اشعار کے انتخاب میں بھی انہوں نے چنداں کاوش سے کام نہیں لیا جس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا ذوق ایک خاص دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا تھا۔

کتاب کی اہمیت:

تاہم اس حقیقت سے کوئی بھی ایک لمحے کے لیے انکار یا اختلاف نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب بے شمار ایسے شاعروں کے کلام کے انتخاب کا مجموعہ ہے جن کے دیوان نہ کبھی چھپے نہ ان کے لیے عام ہاتھوں میں پہنچنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی، نہ اب ایسا کوئی امکان نظر آتا ہے، آرزو نے ان کا خاصا کلام محفوظ کر دیا ہے جس کے محفوظ ہونے کی غالباً اور کوئی صورت نہ تھی۔ ضمناً وہ بعض مفید نکات بھی لکھتے جاتے ہیں اس وجہ سے ''مجمع النفائس'' فارسی اشعار کا واقعی ایک قابل ذکر مجموعہ ہے اور یہ مجموعہ اس کمی کو ایک حد تک پورا کر رہا ہے جو بیشتر شعرا کے دواوین دسترس میں نہ ہونے کے باعث رونما تھی۔ یہ ایک فاضل اجل کا فراہم کردہ مجموعہ ہے جس کے ذوق کے متعلق جو رائے چاہیں قائم کریں مگر اپنے دور میں رموز و دقائق زبان اور حقائق شعر کا وہ سب سے بڑا ماہر مانا جاتا تھا۔

❖•••❖•••❖•••❖

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

۱۔ مجموعۂ نغز، ص: ۲۴

۲۔ شمع انجمن، ص: ۴۲ بظاہر یہ تاریخ آزاد بلگرامی کے ''خزانۂ عامرہ'' سے ماخوذ ہے۔

۳۔ سرو آزاد، ص: ۲۲۷

۴۔ خزانۂ عامرہ، ص: ۱۱۷

۵۔ سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، ص: ۳۱۳

۶۔ خزینۃ الاصفیا، جلد اول، ص: ۳۵۴

۷۔ سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، ص: ۳۱۳

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۲

۱۱۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۳۱۳

۱۲۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۳۱۴

۱۳۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۳۱۴

۱۴۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۹۰

۱۵۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۹۰

۱۶۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۸۷

۱۷۔ ایضاً، دفتر ثالث، ص: ۲۱۸

۱۸۔ مثلاً سفینۂ ہندی مرتبہ بھگوان داس ص: ۵

۱۹۔ سفینہ، ص: ۳۱۴

Scanned by CamScanner

۲۰۔ سفینہ، ص: ۳۱۴

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ خزانہ عامرہ ص: ۱۱۸ خمخانۂ جاوید (جلد اول) میں بہ سلسلہ احوال آرزو دہلی پہنچنے کی تاریخ ۱۱۳۶ھ لکھی ہے اور اسے فرخ سیر کا دور قرار دیا گیا ہے۔ یہ یا تو چھاپے کی غلطی ہے یا جس کتاب سے حوالے کی یہ تاریخ لکھی گئی ہے، اس سے غلطی سرزد ہوئی۔ فرخ سیر غریب تو ۱۱۳۱ھ ہی میں ختم ہو چکا تھا۔

۲۳۔ خزانۂ عامرہ ص: ۱۱۸

۲۴۔ سفینہ خوشگو، ص: ۳۱۹

۲۵۔ سفینہ، ص: ۳۲۰

۲۶۔ سفینہ، ص: ۲۳۲

۲۷۔ سفینہ، ص: ۳۱۹

۲۸۔ خزانہ عامرہ، ص: ۱۲۲

۲۹۔ سیر المتاخرین ص: ۸۴۷، ۱۲ صفر ۱۱۵۳ھ کو (۲۸ اپریل ۱۷۵۴ء) تھی۔ خزانہ عامرہ میں تاریخ ۱۱۵۲ھ چھپی ہے جو یقیناً چھاپے کی غلطی ہے۔ خود سیر المتاخرین میں ۱۲ صفر کی جگہ دو صفر ہے جو اس وجہ سے غلط ہے کہ دن جمعرات کا تھا اور انتقال پیر کو ہوا تھا۔ پیر ۲ کو نہیں ۱۲ صفر کو تھا۔

۳۰۔ خزانہ عامرہ، ص: ۱۱۹

۳۱۔ مفتاح التواریخ، طبع دوم، ص: ۳۳۸

۳۲۔ خزانہ عامرہ، ص: ۱۱۹

۳۳۔ مفتاح التواریخ، ص: ۳۳۸

۳۴۔ مردم دیدہ، ص: ۵۶

Scanned by CamScanner

۳۵۔ مردم دیدہ، ص:۵۶

۳۶۔ نگارستان فارس طبع ۱۹۵۷ء، ص:۲۶۹

۳۷۔ ایضاً، ص:۲۷۱

۳۸۔ عقد ثریا، ص:۷، ۸

۳۹۔ تذکرۂ ریختہ گویاں، ص:۶، ۷

۴۰۔ مخزن نکات، ص:۱۴

۴۱۔ سرو آزاد، ص:۲۲۷

۴۲۔ تذکرہ حسینی، ص:۴۸

۴۳۔ عقد ثریا، ص:۷

۴۴۔ یہ عبارت ''مجمع النفائس'' کی ابتدائی تحریر سے ماخوذ ہے۔

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ خزانۂ عامرہ، ص:۱۱۸

۴۷۔ ایضاً

Scanned by CamScanner

۲

آرزو کے سوانح

مجمع النفائس کے مولف سراج الدین علی خان آرزو نے اپنے حالات کتاب میں دو جگہ لکھے ہیں لیکن کسی بھی جگہ مختلف حالات کی ایسی وضاحت نہیں کی کہ ان کا پورا نقشہ تاریخی پس منظر کے ساتھ آئینے کی طرح مجلا سامنے آ جائے۔ خود میں نے بھی آرزو کے ذکر میں بعض سوانح کا اضافہ کیا لیکن اس مقام پر مفصل حالات زندگی نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ صرف مجملاً ہی چند باتیں بڑھائی جا سکتی تھیں۔ (مقدمہ مرات ...) اب وقت دل آیا کہ سب سے پہلے آرزو کے سوانح حیات مکمل کرنے چاہئیں جن کے بغیر ان کی علمی زندگی، رتبۂ فضیلت اور درجۂ کردار کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آرزو نے صرف فارسی ہی کی خدمت کے لیے زندگی وقف نہیں کی بلکہ اردو کے ابتدائی دور نشو و ارتقا میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ~~جو آج ہماری قومی زبان ہے یعنی~~ یقیناً اسی بنا پر مجموعہ نغز کے مصنف نے فرمایا تھا:

"بہ مثابہ کہ اہل حق را دامت برکاتہم عیال امام ہمام قبلۂ انام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ می گویند شعرای ہندی زبان را عیال خان آرزو می گویند می سزد۔"[1]

آرزو کی شعر گوئی یا مختلف تصانیف کے متعلق کسی کی رائے کچھ ہو، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا کہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں وہ ملک کے ایک ممتاز عالم اور بلند پایہ شاعر و ادیب مانے جاتے تھے۔ بلکہ انہیں اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کا سرخیل بھی قرار دیا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ پھر انھوں نے ادب کے مختلف دائروں میں اہم تصانیف ترتیب دیں جن میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان جیسی تصانیف پہلے فارسی میں موجود نہ تھیں۔ اس اعتبار سے ان کے سوانح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

آرزو کے معاصر

بعض معاصرین نے بھی آرزو کے سوانح سے خاص اعتنا فرمایا تھا۔ ان میں سب سے بڑھ کر قابل ذکر میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں جن کا تاریخی ذوق بہت عمدہ اور سلجھا ہوا تھا لیکن وہ خلد آباد (نزد اورنگ آباد۔ دکن) میں مقیم تھے اور صرف خط و کتابت کے ذریعے سے مختلف معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ با ایں ہمہ انہوں نے پہلے "سرو آزاد" (ماثر الکرام دفتر ثانی) میں آرزو کے حالات لکھے اور یہ کتاب آرزو کی زندگی ہی میں مکمل ہو گئی، اور "خزانۂ عامرہ" مرتب کرتے وقت مزید حالات فراہم کیے۔ اس وقت تک آرزو کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ انتقال اور

[1] مجموعہ نغز، ص: ۲۴

1368

1489